نریندرا مودی کی قید میں!

مفتی عبدالقیوم منصوری [1]

یہ ۱۷؍اگست ۲۰۰۳ء کی صبح تھی۔ میں ڈابھیل اپنے استاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری اور دیگر اساتذہ وطلبہ سے ملاقات کے بعد کفلیتہ پہنچا کہ صبح ۱۰ بجے میرے موبائل پر ایک کال آئی جس کا نمبر دیکھ کر مَیں بے چین ہوگیا کیوں کہ یہ نمبر پچھلے ایک ہفتے سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایسے آثار نظر آرہے تھے کہ کسی بھی وقت مجھے بھی پولیس کرائم برانچ کا بلاوا آسکتا ہے کیوں کہ مجھ سے قبل

---

[1] یہ ۲۷فروری ۲۰۰۲ء کا الم ناک دن تھا، جب گودھرا ٹرین کی آتش زدگی کے فوراً بعد بھارتی ریاست گجرات میں مسلمانوں کے گھروں پر انتہاپسند ہندوؤں نے حملے کر کے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ایک ہزار سے زیادہ مسلمان مار دیے گئے، گھر جلا دیے گئے اور عورتوں کی اجتماعی بے حُرمتی کی گئی۔ تب نریندرا مودی گجرات کے وزیراعلیٰ اور اس 'آپریشن مسلمان' کے عملاً کمانڈر تھے۔ تباہ حال مسلمان گھرانوں کی بحالی کے کاموں میں دیگر مسلمان رضا کاروں کی طرح جمعیۃ العلما، مہاراشٹر کے رہنما مفتی عبدالقیوم منصوری بھی سرگرم تھے۔ ۲۴ ستمبر ۲۰۰۲ء کو اکشردھام مندر میں گرنیڈ حملے میں ۳۲؍افراد ہلاک ہوگئے۔ اس حادثے میں مفتی عبدالقیوم اور دینی رہنماؤں کو پھانسنے کے لیے ۱۷؍اگست ۲۰۰۳ء کو گرفتار کر کے تعذیب خانوں میں ڈالا گیا۔ آخرکار 'دہشت گردی روک قانون' (POTA) کی عدالت نے ۲ جولائی ۲۰۰۶ء کو مفتی صاحب کو سزاے موت سنائی۔ ہائی کورٹ میں اپیل کی تو اس نے ۲۴؍اپریل ۲۰۰۸ء کو فیصلہ محفوظ کیا اور ۲۶ ماہ بعد یکم جون ۲۰۱۰ء کو سزاے موت برقرار رکھنے کا حکم دیا۔ اس پر سپریم کورٹ میں اپیل کی تو وہاں سے ۱۶ مئی ۲۰۱۴ء کو مفتی صاحب اپنے تمام ساتھیوں سمیت بے گناہ قرار پاکر، گیارہ برس بعد رہا ہوئے۔ بھارت کے مسلمان ایسے صدمات سے گزر رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنی رُوداد گیارہ سال سلاخوں کے پیچھے لکھی ہے، اس سے چند صفحات پیش ہیں۔ ادارہ

کئی حضرات کو کرائم برانچ میں بلایا، دھمکایا، مارا پیٹا اور غلط مقدمات میں پھنسا دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری، مولانا احمد مظاہری پٹنی، مفتی یحییٰ صاحب، مفتی رضوان صاحب اور مفتی امتیاز صاحب بھی اس مکروہ ترین مرحلے سے گزر چکے تھے، لہٰذا مجھے بھی خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ کب بلاوا آجاتا ہے؟

آخرکار ۱۷ اگست ۲۰۰۳ء اتوار کے روز صبح ۱۰ بجے انھی صاحب کا فون آیا: 'بھائی تو کہاں ہے؟' میں نے پوچھا: 'کیا کام ہے؟' کہا: 'سانگھل صاحب بلا رہے ہیں'۔

میں نے کہا: 'میں پالن پور میں ہوں'۔ جواب ملا: 'تو کب آئے گا؟' میں نے بتایا: 'شام تک آجاؤں گا'، تو جواب آیا: 'پالنپور صرف دو تین گھنٹے کا راستہ ہے، تجھے اتنی دیر کیوں ہوگی؟'

میں نے اپنا موبائل فون بند کر دیا اور وہاں سے فوراً ڈابھیل آکر اپنے بزرگوں کو یہ بات بتائی اور دُعا کی درخواست کی۔ کھانے کی دعوت حضرت مولانا محمد سملکی کے گھر تھی، لیکن اس تشویش ناک خبر سے میرا اور میرے رفقائے سفر کا کھانا بھی بدمزا ہوگیا اور واپسی کا سفر شروع ہوا۔ میں اپنی فکر میں ڈوبا ہوا تھا اور گاڑی کی رفتار سے تیز خیالات اور وساوس کی رفتار تھی کہ اب کیا ہوگا؟ مجھے کیوں بلایا گیا ہے؟ پورا سفر میں نے اور ساتھیوں نے اضطراب میں گزارا۔

شام کو تقریباً پانچ بجے شہر احمد آباد میں داخل ہوکر سارنگ پور، رنگ بھون کے قریب موبائل چالو کیا ہی تھا کہ ان صاحب کا فون آ گیا کہ 'تو کہاں تک پہنچا ہے؟' میں نے کہا: 'بس احمد آباد میں داخل ہو رہا ہوں'۔ کہنے لگے: 'لوکھنڈ والا ہسپتال آجا، تجھے لینے کے لیے وہ حضرات تیرا انتظار کر رہے ہیں'۔ مَیں مغرب کی نماز سے کچھ قبل لوکھنڈ والا ہسپتال پہنچا تو وہاں وہ جناب اور ایک صاحب موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ 'کرائم برانچ والے کہتے ہیں کہ یہاں مناسب نہیں ہے، حاجی سخی مسجد پہنچ جاؤ، وہاں سے لے جائیں گے'۔ میں حاجی سخی مسجد گیا اور اپنے رفیقِ سفر مولانا یوسف صاحب کو اپنا موبائل، اسکوٹر کی چابی اور دیگر کچھ چیزیں سپرد کیں اور بیٹے معاویہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مسجد پہنچتے ہی کرائم برانچ کے تین چار افسران ملک صاحب کی قیادت میں مسجد میں تشریف لائے جو سارے مسلمان تھے۔

انھوں نے آکر مجھ سے مصافحہ کیا۔ پی ایس آئی ملک صاحب مجھ سے اچھی طرح واقف

تھے، تاہم سرسری طور پر پوچھا: 'آپ ہی مفتی عبدالقیوم ہیں'۔ میں نے کہا: 'جی ہاں'۔ کہا: 'ہم آپ کو لینے کے لیے آئے ہیں، میں نے ان سے پوچھا: 'مجھے کیوں بلایا گیا ہے؟' انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ 'مولانا عبداللہ کو بھی آج ہی صبح کی نماز کے وقت پکڑ لائے ہیں، اس لیے آپ گھر والوں کو بھی اطلاع دے دو، تاکہ وہ فکرمند نہ ہوں، ان شاء اللہ دو چار روز میں ہم آپ کو واپس چھوڑ جائیں گے'۔ میں نے مولانا یوسف صاحب سے کہا کہ 'میرے گھر والوں کو یہ اطلاع دے دیں'۔شاید اسی وقت ان حضرات نے میرے گھر یہ اطلاع دے دی تھی، چنانچہ کچھ ہمدرد ساتھی مسجد ہی میں آگئے اور انھوں نے مشورہ دیا کہ 'آپ ہرگز نہ جائیں، ہم کرائم برانچ والوں کو ٹال دیں گے'۔ میں نے کہا کہ 'میں نے کوئی جرم نہیں کیا، لہٰذا مجھے ضرور جانا چاہیے'۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا، کرائم برانچ کے افسران نے کہا کہ ہم مغرب بعد چلیں گے، مغرب کی نماز خوف و ہراس اور وسوسوں کی نذر ہوگئی۔ نماز کے بعد مختصر سی دُعا کی اور کرائم برانچ کے افسروں کے ساتھ ہولیا۔اس وقت میرا گھر حاجی سخی کی مسجد سے متصل ہی تھا۔ پولیس والوں کے ساتھ نکلتے ہوئے میں نے صحن سے اپنے گھر والوں کو الوداعی ہاتھ ہلایا۔ مجھے کب پتا تھا کہ یہ جدائی صرف دو چار دن کی نہیں بلکہ گیارہ برسوں کی ہے۔

بہرحال مکروفریب سے مجھے اغوا کر کے کرائم برانچ کے ایک کانسٹیبل نے اپنی موٹرسائیکل پر سوار کرلیا۔ میں حسرت بھری نگاہوں سے اپنی پیاری مسجد اور محلّے کو دیکھ رہا تھا۔ دریاپور چارواٹ سے گزرتے ہوئے خلیل بھائی کی چائے کی دکان پر میں نے اپنے والد (مرحوم) کو چائے پیتے ہوئے دیکھا اور صرف ہاتھوں سے اشارہ کیا، کسے علم تھا کہ میں اب اپنے والد کی معیت وصحبت کبھی بھی نہیں پاسکوں گا۔ ابّا بھائی اور مولوی یوسف کرائم برانچ کے آفس تک میرے پیچھے آئے، اور بڑی بے چارگی سے مجھے الوداع کہہ کر واپس آگئے۔

عشاء سے قبل گائیک واڑ کی حویلی، کرائم برانچ پہنچ کر جناب پی ایس آئی محبوب ملک مجھے ایک خستہ حال عمارت کی دوسری منزل پر لے گئے۔ وہاں ایک ہال نما کمرہ تھا جہاں مَیں نے مولوی عبدالصمد حیدرآبادی اور دیگر کچھ مظلوموں کو آنکھوں پر پٹی اور ہاتھوں میں ہتھ کڑی لگی حالت میں بے بس و مجبور دیکھا۔ مولوی عبدالصمد صاحب میری محبوب ترین مادرعلمی جامعہ ڈابھیل سے فارغ

تھے۔ مَیں ان مظلوموں کو دیکھ کر اپنی فکر بھول گیا۔ مجھے وہاں ایک افسر پی آئی ماوانی کے دفتر میں بٹھادیا گیا اور محبوب ملک نے مجھے ایک چادر دی اور کھانا لاکر دیا اور ساتھ ہی اپنا دستی رومال نکال کر میری آنکھوں پر باندھ دیا۔ عشاء کی نماز بڑی رغبت و استحضار کے ساتھ پڑھی اور کھانا بڑی بے رغبتی سے کھایا۔ اس حالت میں جو اوراد و اَذکار یاد آرہے تھے پڑھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اللہ سے خیروعافیت کی دُعا کر رہا تھا۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے ملک صاحب آئے، میرا ہاتھ پکڑ کر سیڑھی سے اُتار کر نیچے لائے۔ سیڑھی اُترتے ہی اے سی پی گریش کمار سانگھل کے آفس میں لے جاکر میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ وہاں سانگھل صاحب تشریف فرما تھے۔ انھوں نے ملک صاحب و دیگر کو آفس سے باہر نکال دیا اور کچھ دیر تک مجھے گھورتے رہے۔ الحمدللہ، میں نے بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں جمائے رکھیں (وہاں کی 'مہمان نوازی' سے مشرف ایک صاحب نے مجھے بتلایا تھا کہ سانگھل صاحب اگر آپ کو گھورنے لگے تو آنکھیں نہیں چرانا چاہییں ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ آپ مجرم ہیں)۔ کچھ دیر بعد انھوں نے اپنی زبان کو تکلیف دی اور اس طرح گفتگو ہوئی:

سانگھل: 'تجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟' میں نے کہا: 'مجھے پتا نہیں ہے'۔ سانگھل صاحب غرائے: 'سوچ کر بتا، کچھ تو ہوگا جس کی وجہ سے تجھے یہاں لایا گیا ہے؟' میں نے سوچا کہ شاید بواہر ہال ریلیف کیمپ کے حساب کتاب کے معاملے میں بلایا گیا ہو۔ اس لیے مَیں نے جواب دیا کہ 'ریلیف کیمپ کے حساب کتاب کے سلسلے میں بلایا گیا ہے'۔ سانگھل نے کہا: 'اور سوچ کر بتا تُو نے کیا کیا ہے؟' جواب دیا: 'میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا'۔ سانگھل نے کچھ دیر گھورنے کے بعد کہا: 'حیدرآباد سے کون آیا تھا؟' میں نے جواب دیا: 'مولوی عبدالصمد آئے تھے'۔

سانگھل نے کہا: 'اور کون آیا تھا؟' میں نے بتایا: 'حیدرآباد کے بہت سے طلبہ ڈابھیل پڑھتے تھے، وہ بھی احمدآباد آتے تھے'۔ اس پر سانگھل نے اچانک پوچھا: 'لیاقت سے کیا بات ہوئی تھی؟' اس پر مَیں یہ سمجھا کہ لیاقت چونے والا جس سے میں اکثر ہنسی مذاق کرتا تھا۔ غالباً اس سے گفتگو کا کوئی شرارت بھرا فون ٹیپ کرلیا گیا ہے، چنانچہ یہ سوال سنتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

ناقابلِ برداشت تشدد کا آغاز

میری اس مسکراہٹ پر سانگھل صاحب بھڑک اُٹھے اور مجھے واہی تباہی گندی گالی دیتے ہوئے اُٹھ کر بے ساختہ مجھے ڈنڈے سے پیٹنا شروع کر دیا۔ کچھ ڈنڈے مارنے کے بعد کہا: 'جا، کل تجھے پتا چل جائے گا کہ تجھے ہم یہاں کیوں لائے ہیں؟' پھر ایک ناقابلِ بیان، بے انتہا ظلم وستم اور وحشت و درندگی سے بھرپور غم ناک داستان کا آغاز ہوا۔ مجھے آنکھوں پر پٹّی باندھ کر دفتر میں بھیج دیا گیا۔ اُس رات دیر سے پھر جناب ملک اور اشرف چوہان تشریف لائے۔ اشرف چوہان صاحب اگرچہ مسلمان تھے، لیکن ان کے کارنامے کسی درندہ صفت یہودی کو بھی شرما دینے کے لیے کافی تھے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا: 'تجھے اور مفتی سفیان کو ملک مخالف حرکتیں نہیں کرنی چاہییں تھیں'۔ میں نے کہا: 'میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے'۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ اچانک پی ایس آئی ماوانی آ گیا اور وہ دونوں حضرات چلے گئے۔ کرائم برانچ کی یہ پہلی رات بڑی تاریک وخوف ناک معلوم ہو رہی تھی۔ چھوٹا سا کیبن نما آفس، اندھیری رات اور پھر آنکھوں پر پٹی۔ گہری رات کی خاموشی میرے خوف و ہراس کو بڑھاتی رہی۔ اللہ اللہ کر کے صبح ہوئی۔ دوپہر تقریباً ۱۲ بجے مجھے لینے کے لیے ایک کانسٹیبل آ گیا کہ: 'ونجارا صاحب بلا رہے ہیں''۔

گرفتاری سے قبل مسٹر ونجارا کا 'نام' اور 'کام' سن رکھا تھا، دیدار ۱۸/اگست ۲۰۰۳ء، پیر کے روز دوپہر کو نصیب ہوا۔ آفس میں لے جا کر میری آنکھوں سے پٹّی ہٹائی گئی تو کاؤنٹر ٹیبل کے پیچھے لال داڑھی والے چشمہ لگائے ہوئے ونجارا صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کی بائیں جانب کرسیوں پر کچھ دوسرے افسران بیٹھے تھے، جن میں سے سانگھل صاحب سے تو گذشتہ رات تعارف ہو چکا تھا۔ دوسرے حضرات میں وکھت ڈیوی ونار، آر آئی پٹیل وغیرہ شامل تھے، جن سے بعد میں واقفیت ہوئی۔ مجھے لے جا کر ان کے جوتوں کے پاس زمین پر بٹھا دیا گیا اور بات شروع کرنے کی ذمہ داری ونجارا نے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے گذشتہ رات والا سوال دہرایا کہ 'حیدر آباد سے کون آیا تھا؟' میں نے وہی جواب دیا: 'مولانا عبدالصمد صاحب آئے تھے'۔ ونجارا نے کہا کہ 'ڈنڈا پارٹی کو بلاؤ'۔ یہ ڈنڈا پارٹی پانچ، چھے درندوں اور وحشیوں پر مشتمل تھی۔ یہ بھوکے بھیڑیے اور وحشی خود مارتے ہوئے جب تک تھک نہ جاتے مار پیٹ اور ظلم وستم کا سلسلہ جاری رہتا تھا، یا پھر

مار کھانے والا مرجائے یا بے ہوش ہوجائے تو ہوش آنے تک یہ سلسلہ رُک جاتا۔

چنانچہ ڈنڈا پارٹی آ گئی۔ انھوں نے آ کر میرے ہاتھ میں بیڑیاں ڈال دیں۔ ایک موٹے تازے بھینسے جیسے ظالم نے تیزی سے لپک کر مجھے کمر سے دبوچ لیا۔ دوسرے نے دونوں پیر پکڑ لیے۔ تیسرے شخص نے باوجود یہ کہ میرے ہاتھوں میں بیڑیاں تھیں میرے دونوں ہاتھ کندھوں سے پکڑ کر مجھے اُلٹا کھڑا کر دیا اور وی ڈی ونار نے میری پشت اور کولھوں پر انتہائی درندگی سے ڈنڈے برسانے شروع کیے۔ الحمدللہ، ہر ڈنڈے کی ضرب پر مَیں 'اللہ اکبرُ' کی صدا لگا رہا تھا۔ جب مَیں اللہ اکبر کہتا تو بنجارا صاحب نہایت گندی گالیاں بک کر کہتا کہ: 'تمھارا اللہ تمھارا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ دیکھ، آج ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ تمھارے پاس کیا ہے؟ اگر اللہ تیرے ساتھ ہے تو یہ بیڑیاں توڑ دے اور رہا ہوکر دکھلا دے'۔ اسی طرح اللہ رب العزت، جنت، حُور وغیرہ کے متعلق نہایت گھٹیا اور ناقابلِ بیان تبصرے کرکے اپنے دل کی خباثت وگندگی کا ثبوت دیتا رہا۔

اسی طرح وِھت دیوی ونار کا تعارف اگر مَیں ان الفاظ میں کراؤں کہ ظلم اور ونار، ایک سکّے کے دو رُخ تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑھ کر ظالم شخص نہیں دیکھا۔ اس کے تعصب اور اسلام دشمنی کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دورانِ ریمانڈ یہ جنگلی درندے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑتا۔ مجھے لہولہان کرتے ہوئے بے ہوش کر دیتا۔ یہ اسلام اور مسلمانوں پر ناقابلِ بیان گندے تبصرے کرتے ہوئے مجھے اکثر کہتا کہ: 'ہماری پولیس، حکومت اور عدالتیں بے وقوف ہیں کہ مقدمات درج کرکے تم لوگوں پر فضول خرچی کرتے ہیں۔ تم مُسلوں کو تو گولی مار دینی چاہیے'۔

ونار نے کتنے ڈنڈے برسائے معلوم نہیں، آخر وہ تھک گیا اور اس کی سانس پھولنے لگی تو وہ رُک گیا۔ تب بنجارا نے براہِ راست سوال کیا کہ: 'بتا، اکشردھام مندر پر حملہ کس نے کروایا تھا؟' یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی اور کلیجہ منہ کو آ گیا، زبان کانٹے کی طرح خشک ہوگئی اور پہلی مرتبہ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا کہ مجھے کس بھیانک جرم میں پھنسانے کی سازش ہورہی ہے۔ میں نے پوری قوت سے چلّا کر کہا کہ: 'خدا کی قسم! میں بالکل بے قصور ہوں اور مَیں اس معاملے میں کچھ بھی نہیں جانتا'۔ بنجارا نے برہم ہوکر ونار سے کہا: 'مارو اسے'۔ اس ظالم نے

دوبارہ میرے کولھوں پر نہایت ہی جنون و پاگل پن سے ڈنڈے برسانے شروع کر دیے، یہاں تک کہ میرے کپڑے خون سے تر ہوگئے۔ تو بنجارا نے حکم دیا: 'اس کے ہاتھوں پر مارو'۔ پھر میری ہتھیلیوں پر اتنے ڈنڈے برسائے کہ ہتھیلیوں کا رنگ بدل گیا اور دونوں ہتھیلیاں زخموں سے چُور ہوگئیں۔ بنجارا کی نظر میرے پیروں پر پڑی تو کہنے لگا: 'دیکھو، کتنا موٹا تازہ ہے، اس کے پیروں پر ڈنڈے برساؤ'۔ چنانچہ ظالموں نے مجھے گرا دیا اور وہ موٹا و مکروہ شخص مجھے اُلٹا منہ کے بل لٹا کر میری پُشت پر بیٹھ گیا، دوسرے دو لوگ میرے پیروں پر بیٹھ گئے۔ دو لوگوں نے میرے ہاتھ اور سر کو پکڑ لیا۔ پھر ونار نے اسی حالت میں میرے پیروں کے تلووں پر ڈنڈے برسانے شروع کیے اور برساتا ہی رہا۔ جب تھک جاتا تو کچھ دیر کو رُک جاتا۔ اس کے رُکنے پر بنجارا گالی دے کر کہتا: 'اور مارو، کیوں رُک گئے؟' وہ کہتا: 'صاحب تھک گیا ہوں، تھوڑا آرام کرلوں'۔ پیروں سے ہٹ کر پیچھے مارنا شروع کرتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کتنی دیر تک یہ سلسلہ چلا اور مجھے کتنے ڈنڈے مارے گئے۔ میرے اندازے سے کم از کم ڈیڑھ، دو سو ڈنڈے ضرور مارے تھے۔ آخرکار میں بے ہوش ہوگیا۔ جب مَیں ہوش میں آیا تو مَیں نے پانی طلب کیا۔

پیروں کے تلوے بے شمار ڈنڈے مارے جانے کی وجہ سے بالکل زخمی ہوگئے اور ہاتھوں اور پیروں میں ورم آ گیا۔ چلنا تو درکنار مَیں اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ جیسے ہی مَیں بات چیت کرنے اور مزید مار پیٹ کے کھانے کے قابل ہوگیا تو مجھے پکڑ کر اُٹھایا گیا اور اب کی بار بنجارا نے یہ کہا کہ: 'مندر پر حملہ کرنے کے لیے تو نے حیدرآباد سے کسے بلایا تھا؟' سوال کا منشا یہ تھا گویا مَیں ہی اکشردھام مندر پر حملے کا ملزم ہوں۔ اس لیے مجھے حملہ آوروں اور سازش میں شریک دوسرے افراد کے نام بتانے تھے۔ میں نے کہا: 'مَیں بے قصور ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم'۔ تو مجھے پوچھا گیا: 'اے بھائی' کو جانتے ہو؟' میں نے کہا: 'نہیں جانتا'۔ بنجارا کے حکم پر 'اے بھائی' کو طلب کیا گیا۔ چنانچہ 'اے' بھائی کو بھی اسی طرح آنکھوں پر بندھی پٹّی کے ساتھ دفتر میں لایا گیا اور اسی پٹّی بندھی حالت میں مجھ سے کہا گیا کہ: 'تو اسے جانتا ہے؟' میں نے کہا: 'نہیں جانتا'۔ تو کہا گیا: 'مگر یہ تجھے جانتا ہے'۔ اس کے بعد میری آنکھوں پر پٹّی باندھی گئی اور اے بھائی کی آنکھوں سے پٹّی ہٹائی گئی۔ چنانچہ ان سے پوچھا گیا کہ: 'تو اسے جانتا ہے؟' انھوں نے کہا: 'جی ہاں،

یہ مفتی عبدالقیوم ہے'۔ اب میری آنکھوں سے بھی پٹی ہٹا کر کہا: 'دیکھ، یہ تجھے اچھی طرح جانتا ہے تو اسے کیوں نہیں جانتا؟' اور ساتھ اے بھائی سے کہا گیا: 'تو اسے بتا، تو اسے کیسے جانتا ہے؟' اے بھائی نے بتانا شروع کیا: 'یہ مفتی عبدالقیوم صاحب جو بواہر ہال میں ریلیف کیمپ چلاتے ہیں۔ ان کے ساتھ عبدالرحمٰن پانار، اور خالد شیخ بھی ہیں۔ یہ لوگ کیمپ کے انچارج ہیں'۔ اور پھر ایک نہایت ہی گھناؤنی اور گھٹیا کہانی بیان کرنا شروع کی۔

میں یہاں پر وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُوپر کی سطروں میں اے بھائی کے حوالے سے جو باتیں بیان اور ذیل کی سطور میں ان کے حوالے سے جو کہانی درج کی جارہی ہے، اس معاملے میں وہ بالکل بے قصور ہیں۔ کیوں کہ وہ بے چارے میری گرفتاری سے آٹھ روز قبل ۹راگست سے کرائم برانچ کی حراست میں تھے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ جیسا ظلم مجھ پر کیا گیا ہے ویسا ہی بلکہ ہوسکتا ہے مجھ سے زیادہ ان پر ظلم کیا گیا ہو۔ چنانچہ میری توقع کے مطابق وہ بھی مظلوم اور بے بس تھے اور ناقابلِ برداشت ذہنی اور جسمانی اذیتیں دے کر انھیں کرائم برانچ کی تیار کی ہوئی ایک جھوٹی کہانی پڑھنے اور قبول کرنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔

صرف اے بھائی ہی نہیں، بلکہ ہم تمام زیرحراست لوگوں کو باہم ایک دوسرے کے خلاف بولنے پر خوب مجبور کیا گیا اور حسب ذیل جھوٹی کہانی تیار کی گئی تھی۔ لیکن جرح کے دوران پوٹا کورٹ کے سامنے کرائم برانچ کے جھوٹ کو بے نقاب کر دیا اور ان کی گواہی بھی ہماری رہائی میں مددگار ثابت ہوئی۔

من گھڑت، واہیات کہانی

بہرحال اے بھائی نے یہ کہانی بیان کرنی شروع کی: 'میں عبدالرحمٰن پانار، مناف اور ناصر میرے دوست ہیں۔ مَیں، عبدالرحمٰن پانار وغیرہ کو بواہر ہال پر ملنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ وہاں ان مفتی عبدالقیوم صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ میرا بھائی عبدالرشید اور کالوپور کے سلیم بھائی اور احمد آباد و گجرات کے دیگر بہت سے مسلمان سعودی عرب، ریاض میں ملازمت کرتے ہیں۔ عبدالرشید وغیرہ سے ہم نے گجرات فسادات کی کارگزاری، بواہر ہال و دیگر کیمپوں میں لُٹے پٹے، بے بس و مجبور مسلمانوں کی خستہ حالی بیان کی۔ ہم نے مسلمانوں کے قتل عام، مالی نقصان کا انتقام لینے کے لیے عبدالرشید اور سلیم بھائی وغیرہ سے تعاون کی درخواست کی تھی جس پر انھوں نے کہا تھا

کہ مقامی ذمہ داروں سے بھی مشورہ اور تعاون کی درخواست کرو۔ چنانچہ مَیں، عبدالرحمٰن، مناف اور ناصر، مفتی عبدالقیوم اور مولانا عبداللہ صاحب سے مشورہ کرنے کے لیے بواہر ہال گئے تھے اور ان حضرات نے نہ صرف مفید مشورے دیے بلکہ ہماری حوصلہ افزائی بھی کی اور کہا تھا: 'بالکل آگے بڑھو، جہاں تعاون کی ضرورت ہو ہم سے بات کرنا'۔

بس اتنا سننا تھا کہ مولانا عبداللہ صاحب کو طلب کر کے ان حضرات کی موجودگی میں مجھے پھر نہایت بے دردی سے پیٹنا شروع کیا۔ میں مار کھاتے کھاتے زمین پر گر کر نیم بے ہوش ہو گیا۔ اب آدم بھائی کی باری تھی۔ مَیں اپنی نیم بے ہوشی کی حالت میں اس بے چارے کی دردناک چیخ پکار اور جگرخراش اور پتھر کو رُلا دینے والی آہیں اور سسکیاں سن رہا تھا۔ میں چوں کہ اپنے پیروں سے چل بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے کچھ لوگ مجھے اُٹھا کر کرائم برانچ میں رمیش ایشور پٹیل کے آفس میں ڈال گئے اور پھر مجھے ۱۲ سے ایک بجے کے درمیان لے گئے۔

رات کو مجھے کھانا دیا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں سوج کر گیند کی طرح گول ہو گئے تھے۔ ان ہاتھوں سے کیوں کر کھایا جاسکتا تھا۔ میں ہاتھ، پیر اور پیچھے کی جانب بے انتہا درد کی وجہ سے سسکیاں اور آہیں بھر رہا تھا۔ اسی حال میں خون آلود کپڑوں کے ساتھ عشاء کی نماز بیٹھ کر ادا کی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، اور اس وقت اللہ رب العزت کی ذات حکیمانہ کا تقرب، دل کی کیفیت اور ایمان کا جو مزا تھا، واللہ! اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔

گذشتہ رات کی طرح یہ رات بھی خوف و اضطراب میں گزری۔ کرائم برانچ کے افسران دیر رات تین چار بجے تک ظلم و ستم کی محفلیں سجاتے، کبھی سانگھل آفس سے کسی مصیبت زدہ کی جگرخراش چیخیں بلند ہوتیں، کبھی بنجارا کے آفس سے زمین و آسمان کو رُلا دینے والی آہیں سنائی دیتیں، تو کبھی ونار اور پٹیل کے دفاتر سے مظلوم و بے بس انسان کی آہ و زاری اور رحم کی بھیک و دہائی سنائی دیتی، لیکن ان آہوں پر خون آشام درندوں کی چنگھاڑ اور وحشیوں کے قہقہے غالب آجاتے تھے۔ رات بھر ظلم و ستم کا بازار گرم رہتا۔ رات میں تقریباً تین چار بجے یہ حضرات اپنے گھروں کو جاتے اور صبح گیارہ بجے واپس آتے تھے۔ بس یہ چند گھنٹوں کا وقفہ کچھ پُرسکون ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے افسروں کی آمد کے ساتھ ہمارے لیے ایک نیا دن، نئی مصیبتوں کے ساتھ شروع ہوتا تھا۔

پورے ۴۰ روز میری آنکھوں پر پٹّی اور دونوں ہاتھوں میں بیڑیاں لگائی جاتی رہیں، حتیٰ کہ رات کو سونے کے وقت بھی ایک ہاتھ اور ایک پیر میں بیڑی لگا کر ٹیبل یا کسی بھی جالی کے ساتھ بیڑی کا دوسرا حصّہ لاک کر دیا جاتا تھا۔ اس حال میں پُرسکون نیند کیسے آسکتی تھی؟ تاہم، نماز، کھانا اور استنجا کے لیے ایک ہاتھ ضرور کھولا جاتا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ تکلیف اور درد استنجا کے وقت ہوتا تھا۔ خون و پیپ کی وجہ سے پاجامہ پیچھے سیرین سے چپک جاتا تھا کہ استنجا کے وقت زور لگا کر کھینچنا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے پاجامہ چمڑی سے الگ ہوتا تو خون و پیپ بہنا شروع ہوجاتی اور اسی حال میں استنجا کرنا پڑتا تھا۔

بنجارا کی گھنٹی کی ڈنگ ڈونگ اور سانگھل کی گھنٹی کی چہچہاہٹ پورے کرائم برانچ میں سنائی دیتی تھی۔ جیسے ہی ان میں سے کوئی گھنٹی بجتی ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونا شروع ہوجاتی تھیں۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی ہم آنکھیں جھکا لیتے، اور زبان پر قرآن اور ذکر و اَوراد جاری ہوجاتے۔ اور پھر آنے والے قدموں کی آہٹ ہم میں سے کسی کے پاس آکر رُک جاتی اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا جاتا کہ بنجارا صاحب اور سانگھل صاحب بلا رہے ہیں۔ کلیجہ اُچھل کر منہ کو آجاتا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا، قدم بوجھل ہوجاتے تھے۔

۱۹/اگست ۲۰۰۳ء، منگل کو دوپہر کے وقت بنجارا کے آفس کی گھنٹی بجی۔ اس بار جب آفس میں لے جا کر میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو وہاں اے بھائی کے علاوہ مولوی عبداللہ، عبدالرحمٰن پانار، مناف، ناصر، محبوب الٰہی ٹیلر وغیرہ حضرات کو موجود پایا۔ یہ حضرات میرے محلے ہی کے باشندے اور میرے اچھے دوست ہیں۔

من گھڑت جھوٹی کہانی کا پہلا حصّہ بیان ہوچکا ہے کہ آدم بھائی و دیگر حضرات مجھ سے اور مولانا عبداللہ صاحب سے مشورے کے لیے آئے تھے اور ہم نے نہایت قیمتی مشورے دے کر ان حضرات کی نہ صرف رہنمائی کی بلکہ تعاون کی پیش کش بھی کی تھی۔

اب یہ کہانی کچھ اس طرح آگے بڑھی کہ مجھے پوچھا گیا: 'اکشر دھام مندر پر حملہ کرنے کے لیے حیدرآباد سے تو نے کن لوگوں کو بلایا تھا؟' میں نے کہا: 'صاحب! مجھے پتا نہیں'۔ بس پھر وہ جسمانی و ذہنی اذیتوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آخرکار مَیں نے ناقابلِ برداشت ظلم وتشدد

سے تنگ آ کر کہہ دیا کہ: 'صاحب، آپ جو کچھ کہیں گے مَیں ماننے کے لیے تیار ہوں'۔ اب مار پیٹ بند ہوگئی اور ہمیں آپس میں کردار طے کرنے کے لیے بات چیت اور مشورے کا موقع دیا گیا۔ مزید یہ کہ: مختلف مقدمات میں 'انتخاب' کا حق بھی دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہمارے ساتھی سلیم بھائی کو اکشر دھام، گودھرا سانحہ اور ہرین پانڈیا تین میں سے کسی ایک مقدمے کے انتخاب کے لیے کہا گیا۔ مجھے بھی ایک مرتبہ سانگھل صاحب نے کالی گیند جیسی ایک چیز بتا کر: ''یہ 'چرس' ہے'' کہتے ہوئے چرس ضبطی کے مقدمے میں پھنسانے کی بھی دھمکی دی تھی۔

دورانِ ریمانڈ مجھے بجلی کے کرنٹ بھی دیے گئے۔ میرے ہاتھوں کی تمام انگلیوں میں کلپ لگا کر اُس کے ساتھ ایک چھوٹے سے الیکٹرک (بجلی کے) مشین کے تار لگائے جاتے اور پھر اُس میں ایک ہینڈل گھمایا جاتا، جس سے میرے پورے جسم میں کرنٹ اور بجلی کی لہر دوڑ جاتی۔ اسی طرح کبھی کبھی بیس بال کے ڈنڈے جیسا ایک بجلی کا ڈنڈا میرے جسم کے مختلف حصوں پر لگایا جاتا اور اس سے مجھے کرنٹ دیا جاتا تھا۔ میری انگلیوں میں ناخن کے نیچے سوئیاں چبھو دی جاتی تھی۔ ریمانڈ کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ملزم کو انگریزی کا 'اُلٹا 'ٹی' بنایا جاتا تھا۔

ظلم و تشدد کے کچھ شرم ناک طریقے

۱- ظلم کا ایک نہایت ہی بہیمانہ طریقہ یہ تھا کہ ملزم کے پاجامے یا شلوار کی آستینیں نیچے سے باندھی جاتی اور ازار بند کھول کر اُوپر سے زندہ چوہے اندر چھوڑ دیے جاتے تھے۔

۲- ایک شرم ناک طریقہ یہ تھا کہ ملزم کو برہنہ کر کے اس کی مقعد میں جبراً موٹا 'ڈنڈا' داخل کیا جاتا تھا یا پھر پچکاری کے ذریعے اندر پٹرول ڈالا جاتا تھا۔ اس وقت کی درد و تکلیف کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

۳- ایک اور وحشیانہ طریقہ یہ تھا کہ شرم گاہ سے بجلی کا تار لگا کر کرنٹ کے جھٹکے دیے جاتے۔

۴- ایک طریقہ یہ تھا کہ ملزم کے سامنے اس کی ماں، بہن، بیوی، بیٹی کے ساتھ نہایت ہی گھٹیا، ناقابلِ بیان فحش گفتگو کی جاتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گندے، فحش اور بازاری لفظوں میں ان قابلِ احترام خواتین کے ساتھ بدفعلی کی دھمکی دی جاتی، بلکہ بعض اوقات صرف دھمکی ہی نہیں واقعتاً یہ شرمناک حرکت کر کے ملزم کو گناہ کے اقرار پر مجبور کیا جاتا تھا۔ مجھے

بھی شرم گاہ پر کرنٹ لگانے اور گھر کی معزز خواتین کے حوالے سے یہی دھمکیاں دی گئیں، لیکن الحمدللہ، اللہ رب العزت نے حفاظت فرمائی۔

اِن کے پاس میرے جمعہ کے خطبات کی کیسٹیں بھی تھیں۔ چنانچہ ریمانڈ کے دوران جب مَیں حسب معمول آہستہ سے جواب دیتا تو کہا جاتا: 'بلند آواز سے بات کر'۔ میں کہتا: 'میری آواز پست ہے'۔ تو کہا جاتا: 'ہمیں معلوم ہے تیری آواز کیسی ہے'۔ ہمارے پاس تیرے جمعہ کے بیانات کی کیسٹیں ہیں تو اسپین کے مسلمانوں کی بربادی کی بہت داستان سناتا ہے'۔

بنجارا کی بہ نسبت سانگھل نے مار پیٹ اور گالی گلوچ قدرے کم کی، کبھی کبھی نرمی سے بھی پیش آیا۔ لیکن شاید یہ بھی کرائم برانچ کے ظلم کا ایک طریقہ ہے کہ ایک مارے اور دوسرا سہلائے۔ ۲۹/اگست ۲۰۰۳ء جمعہ کے دن 'اکشردھام مقدمہ' میں ہماری گرفتاری کا اعلان ہوا۔ رات میں مجھے سانگھل نے بلایا اور کہا: 'دیکھ، ہم نے تجھے اکشردھام مقدمے میں گرفتار کیا ہے اور کل عدالت میں تجھے پیش کریں گے، وہاں ہمارے خلاف کوئی شکایت مت کرنا'۔ میں نے روتے ہوئے کہا کہ: 'صاحب، آپ نے مجھے اتنے بڑے مقدمہ میں پھنسا دیا؟' میری حالت دیکھ کر کہنے لگا: 'میں مجبور تھا، مجھ پر 'اُوپر' سے دباؤ تھا، لیکن تو فکر مت کر، مَیں تیرے گھر کی ضروریات کا خیال رکھوں گا'۔ میں نے کہا کہ: 'اس کی ضرورت نہیں، الحمدللہ میرے دوست اچھے ہیں، وہ خیال رکھیں گے'۔

اُن دنوں انٹیلی جنس بیورو سے بھی دو افسر آتے اور دو تین روز تک مجھے گھنٹوں لے کر بیٹھتے اور کہتے: 'کچھ بتا دے یار'۔ میں تفصیل شروع کرتا تو کہتے: ''بکواس بند کر، یہ سب جھوٹ ہے، کوئی اور کام کی صحیح بات بتا''۔ لیکن مَیں اس کے علاوہ اور کیا بتا سکتا تھا؟

ابتدا میں ایک رات ایک پستہ قد سیاہی مائل رنگت والے صاحب، بنجارا کے آفس میں اس کی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مجھے اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ بنجارا اور دیگر افسران اُن کے سامنے ادب سے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے مجھے متاثر کرنے کے لیے کہا کہ دیکھو: 'میں مسلمان نہیں، لیکن پھر بھی مَیں جب بھی کھانا کھاتا ہوں تو بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھتا ہوں۔ میری بیوی مجھ سے جھگڑا بھی کرتی ہے کہ کیا آپ مسلمان ہو گئے ہیں؟ یا پچھلے جنم میں مسلمان تھے؟ میں کہتا ہوں: مَیں یہ سب نہیں جانتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ کھانا جو ہم کھاتے ہیں یہ

اللہ تعالیٰ نے دیا ہے‘۔

ان باتوں سے مجھے غلط فہمی ہوئی کہ شاید کوئی انصاف پسند افسر ہیں، اس لیے میں نے ہمت کر کے کہا کہ: ’صاحب، میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں‘۔ انھوں نے کہا: ’ٹھیک ہے‘۔ اور بنجارا کے علاوہ تمام افسران کو آفس سے باہر نکال دیا۔ میں نے کہا: ’بنجارا صاحب کو بھی نکال دیجیے‘۔ اُنھوں نے تعجب سے کہا: ’بنجارا کو بھی نکال دوں؟‘ میں نے کہا: ’جی ہاں‘۔ انھوں نے بنجارا سے کہا: ’جایئے صاحب آپ بھی جایئے‘۔ اب صرف ہم دو تھے، انھوں نے کہا: ’کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘ میں نے کہا: ’صاحب میں بالکل بے قصور ہوں، آپ میری مدد کیجیے اور اس مقدمے کی جانچ سی بی آئی کو دے دیجیے‘۔

اتنا سننا تھا کہ وہ صاحب بھڑک اُٹھے اور کہا: ’مُلّا جی، آپ نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی ہے، میں کسی اور ایجنسی کا نہیں بلکہ اسی پولیس کا آدمی ہوں، اب مَیں آپ سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا‘۔ اور اُس رات کے بعد انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ بلکہ دوسرے روز میری شامت آگئی۔ دوپہر میں مجھے بلایا گیا۔ تب بنجارا کا غصّہ ساتویں آسمان پر تھا، مجھے دیکھتے ہی چنگھاڑا: ’تو مجھے میرے آفس سے بھگاتا ہے‘ کہہ کر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی، اور ونار کو مجھ پر مسلط کر دیا۔ پھر اُس نے حیوانیت و درندگی کا وہ ننگا ناچ پیش کیا جس کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

بہرحال، اس عذاب کدے کے جعلی منصوبے کے تحت آدم بھائی، عبدالرحمٰن، مناف اور ناصر کے حصّے میں یہ کردار آیا کہ ان حضرات نے میٹنگ کی، سعودی عرب فون کر کے وہاں سے ۲۵ لاکھ کی امداد طلب کی۔ انھوں نے ۲۵ لاکھ کے بجاے مختلف مرحلوں میں صرف ۶۶ ہزار میں سے ۲۰ ہزار الٰہی درزی کو لوٹا دیے اور صرف ۴۶۰۰ ہی سے کام چل گیا۔ اور پھر آدم بھائی کو سعودی عرب سے حکم دیا گیا تھا کہ حیدرآباد جا کر ابوطلحہ اور ایوب سے ملاقات کریں جو آپ کو اگلے منصوبے سے آگاہ کریں گے۔ آدم بھائی ہم سے مشورہ کر کے حیدرآباد گئے، وہاں ایوب اور ابوطلحہ سے ملاقات ہوئی۔ (گیارہ سال سلاخوں کے پیچھے، از مفتی عبدالقیوم احمد منصوری، جمعیۃ علما، احمد آباد، مہاراشٹر، طبع چہارم، ۲۰۱۶ء، ص ۱-۱۹)